جانشینی اور شوریٰ

الحرمین پبلیشرز - پاکستان . کراچی

جانشینی اور شوریٰ

از قلم

ڈاکٹر علی شریعتی

ترجمہ

ذوالفقار علی زیدی

حسن علی بک ڈپو
بڑا امام بارگاہ کھارادر
کراچی پوسٹ کوڈ 74000 فون 2433055
E-mail: hassanalibookdepot@yahoo.com

ناشر

الحرمین پبلشرز پاکستان کراچی

کتاب کی شناخت

نام کتاب : جانشینی اور شوریٰ
مصنف : ڈاکٹر علی شریعتی
ترجمہ : ذوالفقار علی زیدی
ایڈیشن : دوم
صفحات : ۳۲
سال طبع : مئی ۱۹۹۸ء
ناشر : الحرمین پبلیشرز پاکستان کراچی
قیمت : ۱۵ روپے
کمپوزنگ : غلام عباس وفا
: وقار گرافک اینڈ لیزر کمپوزنگ سینٹر عباس ٹاؤن
ملنے کا پتہ : علی بکڈپو عباس ٹاؤن

اسٹاکسٹ

ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی

علی شریعتی کے بارے میں

عالم انسانیت کی نامور ہستیوں کا ذکر چھیڑا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ فضا کچھ خاصی بوجھل سی ہے اور وقت بڑی سست رفتاری سے گزرتا ہے۔ افق کا رنگ ذرا مختلف سا ہے۔ میدان فکر کی وسعتیں اور گہرائیاں ادراک سے پرے ہیں اور حد نگاہ بہت دور ہے۔ یہیں پر انسانی ہمت جواب دے جاتی ہے اور پاؤں چلنے سے رہ جاتے ہیں' زبان گویائی کی طاقت سے بے بہرہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت انسان حیرانی کا شکار ہو کر سوچنے لگتا ہے! کہاں یہ! کہاں میں!

یہ شخص خدا جانے کہاں سے اپنے کاندھوں پر تاریخ فکر کا بوجھ اٹھائے ایک مرکب پر سوار بجلی کی تیزی اور کڑک کے ساتھ وارد ہوا اور چلا گیا' ہماری دسترس سے کہیں دور' ہم چادر و خیال کی وادی میں تنہا رہ گئے۔ پھر اس کی صدا نے ہمارے خواب بیدار سے ہمیں جھنجھوڑ کر ہوشیار کر دیا۔ کہاں ہو؟ اس صدا کی بے دردی ایک بار پھر ہمیں پکار کر کہتی ہے کہ ہم اپنے آپ میں آ جائیں۔

وہ جو بزرگوں کے قلم کا اظہار تھا ان کا انداز جداگانہ تھا۔ آفرینش کا ہمراز' خلوت و تنہائی کا ہمدم و ہمراز اور داستان ماضی و حال اور مستقبل کی یاد دلانے والا تھا وہ سراپا روح تھا جو جسم کی صورت میں جلوہ گر ہو گیا اس نے علی شریعتی کے نام سے شہرت پائی لیکن وقت سے بہت پہلے شہیدان راہ حق کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ طوس کے ایک زمیندار کا لڑکا خراسان کے گاؤں کا رہنے والا آیا' زندگی اور اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اعتقاد راسخ یہ ہے کہ وہ تاریخ ساز شخصیت تھے۔ ان کے چہرے پر انقلاب کا نور تھا' وہ سیاست دان تھے' اپنے عہد کے پکے اسلام شناس' ادیب اور ہنر مند تھے۔ اور ان تمام چیزوں کو انہوں نے Genius کی سطح سے بلند کر دیا۔ وہ اس قوم اور اس معاشرے کے بارے میں بات کرتے تھے جس کا آدھا حصہ تو ابھی سو رہا ہے جیسے اس پر کسی جادو نے اثر کیا ہو۔ اور دوسرا حصہ جو بیدار ہے وہ بھی فرار کی حالت میں ہے وہ چاہتے تھے کہ ان سوئے ہوؤں کو ان افسوں زدہ لوگوں کو از سر نو بیدار کریں اور انہیں اس قابل بنائیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور علم بغاوت بلند کریں اور جو لوگ آمادہ فرار تھے ان کو واپس لائیں اور اس قابل بنائیں کہ اپنی جگہ پر ثابت قدم رہیں۔ انہوں نے جہاں تک ممکن ہوا اپنی آواز بلند کی اور اپنی زبان کو لفظ آشنا بنایا تاکہ جھوٹ' فریب' دولت اور تزویر جان لیں کہ فرعونی اس قابل نہیں کہ خداوند عالم کی دی ہوئی امانت کو ان سے چھین لے اور قارونی میں یہ دم خم نہیں کہ دولت عشق کو اس سے خرید سکے۔ اور بلعمی کے لئے اس بات کا امکان نہ تھا کہ اس کے مشن کو اس سے الگ کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو غلامی کو قبول کر لیتے اور سر تسلیم خم کر لیتے۔

شریعتی نے اپنے درد و غم کو اپنی تحریروں میں روشن کر دیا ہے۔ انہیں سے انہوں نے ایک قلم بنایا تاکہ اپنی جان کو اس پر قربان کر دے اور اپنے دل سے ایک عشق خونین کو جنم دینے والے کاغذ کی تخلیق کرے جن لوگوں نے علی شریعتی کو دور یا نزدیک سے دیکھا ہے وہ ان کے بیان سے ان کے افکار سے اور

ان کی سوچ سے مانوس ہیں وہ اس بات کو بخوبی جان سکتے ہیں کہ اس دنیا میں روایت سے ہٹ کر ان کی ایک مختلف ہستی تھی ان کا یہ وجود بے حد عزیز اور بے مثال تھا۔ اس اعتبار سے نہیں کہ ان کی ظاہری شکل و صورت دوسروں سے مختلف تھی بلکہ اس لحاظ سے کہ ان کے ذہن اور ان کی فکر کے تار و پود دوسری طرح کے تھے۔ جو شریعتی کو شریعتی بناتے ہیں۔ جو اس انداز سے پروان چڑھے تھے کہ وہ جب کسی چیز کے بارے میں بات کرتے تو ایک خاص انداز سے بات کرتے تھے جو جداگانہ رنگ کا مالک تھا اور اس کا منبع قرآن اور امر حق تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی باتوں میں اثر بھی جداگانہ نوعیت کا تھا۔ ڈاکٹر شریعتی کے دوستوں اور احباب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کا ایمان اور اسلام پر اعتقاد ڈاکٹر شریعتی کی سوچ اور ان کے طرز عمل کا مرہون منت ہو۔

ڈاکٹر شریعتی ایک ایسے استاد' معلم اور رہنما تھے جن کے دل کے سوز نے عشق' شرف' ہمت اور ایمان کو یکجا کر دیا تھا۔ وہ ظلم و تعدی کے خلاف نہایت شوق اور تڑپ کے ساتھ جنگ آزما ہوا کرتے تھے۔ ان کے ہاں ناانصافی کے لئے نہ کوئی نرمی تھی اور نہ کوئی مفاہمت' جب وہ حق کی بات کرتے تھے اس وقت ان کا لہجہ بے حد نرم ہوا کرتا تھا جس کی بنا پر وہ سننے والوں کو اپنی طرف جذب کر لیتے تھے اور سامعین کے سر ان کے سامنے جھک جاتے تھے۔ جب کسی وقت اور کسی لمحے انہیں غصہ آتا تو یوں لگتا کہ وہ اکیلے ہی علم بغاوت بلند کر رہے ہیں۔ اس وقت سننے والوں کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جایا کرتی' اور ان کے دلوں میں

ہزاروں جذبے اور خیالات سر اٹھاتے، ان سب کا غصہ ہوتا، نفرت ہوتی، اور بے زاری ہوتی اور ان سب میں ایک ہی نعرہ ہوتا تھا اور وہ ظلم کے خلاف بغاوت کا اظہار کرتے تھے۔

ڈاکٹر شریعتی راہ سلوک سے آشنا تھے اس راہ پر چلتے تھے اس سے اچھی طرح شناسا تھے۔ اس سفر میں انہوں نے ایک نیا انداز اختیار کیا کہ اس کے ذریعے ہزاروں اشخاص کو راہ راست سے آشنا کیا یہاں تک کہ خود ایثار و شہادت کی بلندیوں تک جا پہنچے۔ اور ایسے ہی ہونا چاہئے تھا۔ وہ شہید ہو گئے، زندہ جاوید ہو گئے، آنے والے زمانوں میں اور مستقبل کی نسلوں کے لئے ان کے افکار ہی باقی رہیں گے وہ زندہ رہیں گے اور ان کے سوا ہر چیز بے نام و نشان موت کی راہ میں گم ہو جائے گی۔

ڈاکٹر شریعتی اس زمانے میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے جب مغربی افکار و خیالات مشرقی ممالک کے جوانوں کے ذہنوں کو اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔ ان جوانوں میں ایرانی بھی تھے۔ وہ اس بات کے معتقد تھے کہ اس نسل میں ادراک و شعور کی ایک مخصوص قوت پوشیدہ ہے اور اس دور کے نوجوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی شخص ان کے ذہنوں میں موجود الجھنوں کو حل کر سکے۔ ان کے اعتقادات کے اصولوں کو واضح کر سکے۔ اور قابل قبول بنا سکے۔ وہ ان کے لئے نہایت دل پذیر اور محکم استدلال پیش کرتے تھے تاکہ ان کے اعتقادات کی جگہ کوئی اور مکتب فکر نہ لے لے۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعتی اس بات میں بالکل درست تھے اور اپنے کام میں کامیاب ہوئے۔ چنانچہ ایران کی گزشتہ چند سو سال کی تاریخ کو جس انداز سے اس مرد مجاہد نے، اس خوش فہم و خوش ادراک نے، اس صاحب نظر دل سوز نے اس تاریخ کو واضح کیا ایسا کام بہت کم کسی نے کیا، ان کی تشخیص تھی کہ مسلمان نوجوان علم و عرفان کے طالب ہیں، معرفت کے پیاسے ہیں، ایسی معرفت ایسا علم جو ان کی روحوں کو مختلف اسلامی افکار اور معانی سے سیر کر سکے۔ وہ خود اسلام کو بڑی اچھی طرح پہچانتے تھے اور نہایت شدت کے ساتھ اس کے پابند تھے۔ لیکن اس انداز سے اور اس زبان و بیان کے ساتھ جو ان کے دور کی ضرورت تھی اور جسے آج اہل علم پسند کرتے ہیں، ان کے تجربے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ جسے اہل نظر کی تائید حاصل ہے۔

شریعتی کو اس بات کا مکمل شعور تھا کہ ان کا معاشرہ کیسا ہے؟ اور اسے کیسا ہونا چاہئے؟ اور اس کے بارے میں کیا کہنا چاہئے؟ انہوں نے جو کچھ کہا وہ دین و مذہب پر مبنی تھا۔ اگر آپ بھی یہ خیال کریں کہ انہوں نے کیسی جرات کی ہے اور ان کے قلم نے کیسی بغاوت کی ہے۔ تو لازم ہے کہ ان کے زمانے کی مشکلات کا احساس کریں، اگر ایسا کیا تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ شریعتی کس قدر مہارت کے ساتھ اپنے موضوع سے عہدہ برآ ہو کر اپنی راہ پر آ جاتے ہیں۔ وہ راہ راست کو حاصل کر چکے ہیں۔ وہی راہ جس میں درد ہے بے دردی نہیں۔

شریعتی اپنے زمانے کے صحرا میں باران رحمت تھے۔ ہماری جوان نسل تشنگی کی وادی برہوت میں کسی اور بات کا تجربہ کئے ہوئے تھی۔ یہ شریعتی ہی تھے جو

اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا جانتے ہیں؟ اور خوب اچھی طرح پہچانتے تھے کہ اسے کیسا ہونا چاہئے تھا؟۔

یہی سبب ہے کہ شریعتی کا روئے سخن دیندار طلبہ کی طرف تھا جن کے افکار پاک تھے اور ایسے طلب علموں کی طرف تھا جو روشن فکر تھے۔ جو تکرار و تقلید کے بھنور میں پھنسے ہوئے نہیں تھے بلکہ ایک تازہ اور جدید تحفے کی تلاش میں تھے۔ اور ایسے کلام کی انہیں ضرورت تھی جو اس نسل کے دلوں میں پیدا ہونے والے احساسات کے مناسب حال ہو۔ شریعتی کی نگاہ میں نسل حاضر اپنے اسلامی عقائد کی خاطر دوسری ثقافتوں کے مقابل میں سر تسلیم خم کرنے کے بجائے اسلامی آئیڈیالوجی کی راہ تلاش کرسکے اور اس سرچشمے سے سیراب بھی ہوگئے۔ شریعتی ہمارے زمانے کی دردمند نسل کے لئے چراغ راہ تھے اور اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ کیسے جینا چاہئے اور کیسے جانا چاہئے اگر ہم انصاف کا دامن ہاتھ میں لیں تو بڑی آسانی سے یہ بات دریافت کرسکتے ہیں کہ شریعتی کے دل میں کیا باتیں پوشیدہ تھیں۔ اور وہ آئندہ نسلوں کو کیا بتانا چاہتے تھے کہ وہ کیسے ہوں اور کیسے بنیں۔

ڈاکٹر شریعتی موجودہ نسل کے بارے میں ہر وقت فکر مند تھے یہی وہ نسل ہے جسے آخر کار نہایت کڑی آزمائش سے گزرنا تھا۔ یہی بات اس کا سبب بنی اور شریعتی نے خواہش کی کہ جس قدر جلد ہوسکے اپنی پوری طاقت سے اپنے دل کی ساری کی ساری باتیں کہہ ڈالیں۔ شاید اسی بنا پر وہ حرف آخر کو ابتدا میں ہی کہتے

ہیں اور ان کے الفاظ میں کیا ہی سچائی ہے۔ "میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے وصیت کردینا چاہئے جن کے لئے میں وصیت کرنا چاہتا ہوں جو یا تو دینی اور عام مدارس کے طلبہ ہیں اور پھر مظلوم و مستضعف لوگ ہیں جو جہالت و زخم و اعدوزی کی قربانیاں ہیں اور پھر وہ باشعور لوگ ہیں جنہوں نے اس دنیا کے عوض اپنے عزت و شرف کو فروخت نہیں کیا۔"

شریعتی مسائل کے بیان کرنے میں استدلالی، منطقی اور انتقادی انداز گفتگو اور خطابت کے فن میں کامل مہارت رکھتے تھے وہ باتوں ہی باتوں میں اپنے قوی سے قوی مخالف کو بھی مفلوج کردیتے تھے۔ اپنی مخصوص صلاحیت اور مخصوص انداز میں جو بظاہر بے حد نرم و نازک لگتا تھا وہ بے فکری اور کج فہمی کی پختہ سے پختہ فصیلوں کے پرخچے اڑا دیتے تھے۔ استدلالی انداز میں گفتگو کے بارے میں ان کا اعتقاد تھا کہ تقریر میں جیومیٹری کا سا تناسب پیدا ہوجائے اور اس میں توازن ہو تو مطلب کے بیان کرنے میں درست انداز حاصل ہوجاتا ہے۔ جس وقت عقیدہ ایسی شکل اختیار کرلے جو جیومیٹری کے جیسے توازن کا رنگ لئے ہو تو اس وقت وہ اس عقیدے کے منطقی اور درست ہونے کی دلیل بن جاتا ہے۔

۱-۲-۳ علی شریعتی کے نزدیک کمزوروں کے استحصال کرنے والے تین قسم کے چہرے ہیں۔ جنہیں وہ "فرعون" "قارون" اور "بلعم باعور" کا علامتی نام دیتا ہے اور اس سے مراد حکمران، سرمایہ دار اور علمائے سوء ہیں۔

مترجم

مقدمہ

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سر سید احمد خان نے اپنے اخبار میں کوئی جملہ ایسا لکھ دیا جو خلافت کے بارے میں شیعہ عقائد کے بالکل مطابق تھا ان کے اخبار کے ایک قاری کو یہ بات بڑی پسند آئی اور اس بارے میں مزید تصدیق کرنے کے لئے سر سید احمد خان کے پاس پہنچا وہاں اس کی اچھی پذیرائی ہوئی اور موضوع پر بات بھی ہوئی اس وقت اس شخص کو بڑا اطمینان ہوا کہ سر سید احمد بڑی حد تک اس کے ہم فکر ہیں۔ شاید اس نے بزعم خود تابوت میں آخری کیل ٹھونکنا چاہا اور ایک سوال پوچھا۔ کہا فرض کریں آج اگر خلیفہ اول اور خلیفہ چہارم زندہ ہوتے اور دونوں کسی سیٹ کے لئے انتخاب لڑیں تو آپ بحیثیت ووٹر کس کو ووٹ دینا پسند کریں گے؟ یہ سن کر سر سید احمد خان نے فوراً جواب دیا "اگر آج دونوں زندہ ہوتے میرے حلقے سے انتخاب لڑتے تو میں بجائے ان کو ووٹ دینے کے تیسرا امیدوار بن جاتا۔" ہر کوئی اس جواب سے اپنی فہم کے مطابق مطلب اخذ کر سکتا ہے مگر اس میں جو چیز نمایاں نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے پوچھنے والے کی علمی، فکری سطح کی کا مذاق ضرور اڑایا ہے۔ یعنی اگر خلافت و وصایت کا تعلق صرف امور مملکت اور حکومت سے تھا تو اس کا محل گزر گیا۔ یوں اس سوال کے پوچھے جانے کا وقت نہیں اور اگر امور مملکت کے علاوہ علمی، عرفانی اور عملی پہلو موجود ہیں تو بھی یہ سوال بے محل ہے کیونکہ تعلیم اور تعلم اور عملی نمونہ بننے کے لئے امور مملکت کا زمام ہاتھ میں ہونا ضروری نہیں۔ اس پہلو سے بھی یہ سوال بے مقصد ہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ صرف ایک عقیدے کا معاملہ ہو جس کے بارے میں

کہا جائے کہ گزشتہ را صلوٰت آئندہ را احتیاط کے مصداق اسے بھول جائیں بلکہ مرحلہ رہنمائی حاصل کرنے کا ہے جسے بھی اپنا رہنما بنائیں اس کا الٰہی معیار مد نظر رکھیں جو "علم و عمل" ہے۔ جس کی سفارش رسولؐ نے کی اور جس کی گواہی بڑے بڑے صحابہ نے دی۔ یہی آج کے مسلمان کی ضرورت ہے۔ گزشتگان میں سے کسی کے کسی عمل میں اگر اسلامی معیار، پورا نظر نہیں آتا تو از روئے رواداری اسے ان کی "اجتہادی غلطیوں" کی فہرست میں شامل کر کے چشم پوشی اختیار کی جا سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص اجتہاد کرے اور حکم خدا تک پہنچ جائے تو دو ثواب ملیں گے اور اجتہاد کر کے حکم تک رسائی نہ پائے تو ایک ثواب ملے گا۔

زیر نظر کتابچہ عظیم انقلابی رہنما سماجیات کی عالمی شہرت یافتہ شخصیت ڈاکٹر علی شریعتی کی ایک تقریر ہے جسے انہوں نے آج سے ۱۸ سال قبل حج کے دوران منیٰ میں چند لوگوں کے سوال کرنے پر جوابا "اجراء فرمایا تھا۔ ان کا یہ جواب کسی خاص مکتبہ فکر کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ صرف اور صرف ان کا ذاتی نظریہ ہے جس کی وضاحت تقریر کے دوران وہ خود کرتے ہیں۔ قارئین کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کے نظریے سے اتفاق کریں یا اختلاف، لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس کتابچے کو پڑھ کر قارئین غور و فکر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ قرآن کریم بھی اپنے ہر قاری کو دعوت فکر دیتا چلا آ رہا ہے۔ ایک لمحے کا غور و فکر ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔

فتفکروا یا اولی الالباب

ذوالفقار علی زیدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سوال:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجتہ الوداع کے موقع پر حضرت علیؑ کو اپنے جانشین کی حیثیت سے مقرر کیا بعد میں کس وجہ سے آپ منتخب نہ ہو سکے؟

جواب:۔ میرے خیال میں یہ سوال بنیادی حیثیت کا حامل ہے یعنی پوری شیعیت کا دارومدار اس سوال کا جواب دینے میں ہے اور ایک مختصر سا جواب دے کر اس سوال کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال امکان اور گنجائش کی حد تک اس کا جواب عرض کروں گا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یہاں بتادوں کہ یہ جواب صرف میرا ذاتی اور انفرادی ہے۔ اور جو کچھ مذہبی حقیقت اور واقعیت ہے اس کے بارے میں ہمیں غور و فکر کرنا چاہئے اور اس پر کام کرنا چاہئے۔ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے اگر ہم ان دلائل کے مجموعے کو دیکھتے ہیں جسے ہمارے اہل سنت بھائیوں نے پیغمبر اکرمؐ کے بعد کے واقعات کے بارے میں اپنے نظریات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر دلائل حق ہیں اور یہی حقیقت ہے۔ دوسری طرف جب ایک غیر جانبدار محقق کی حیثیت سے ان دلائل کا مطالعہ کرتے ہیں جن پر شیعہ تکیہ کرتے ہیں اور اپنے عقائد کو ان کے ذریعے ثابت کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر دلائل حق پر مبنی محکم اور گہرے نظر آتے ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دو گروہ جو متضاد اور متناقض نظریات رکھتے ہوں اپنے اپنے دلائل میں حق بجانب کہلا سکیں۔ کلی طور پر ہمارے اہل سنت بھائیوں کا

کہنا یہ ہے کہ اگر واقعاً پیغمبر اکرمؐ کے بعد کوئی شخص آپ کی جگہ خداوند عالم کی طرف سے منصوب ہو چکا تھا تو پیغمبر اکرمؐ کا یہ فریضہ تھا کہ اسی طرح جیسے قرآن کریم کی آیات کو بڑی باریکی کے ساتھ لکھوایا اور تعلیم دی خداوند عالم کی طرف سے منصوب کئے جانے والے کے بارے میں بھی اسی طرح صراحت کے ساتھ بتا دیتے اور وقت کے ساتھ واضح کرتے کہ آپ کے بعد کوئی سازش کرنے اور توجیہ پیش کرنے کا محل نہیں رہتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حالات کچھ ایسے ہوئے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد صرف مہاجرین ہی نہیں بلکہ ان سے پہلے انصار بھی سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور کوشش کی کہ اپنے لئے ایک حاکم منتخب کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے تمام مسلمان چاہتے تھے کہ ان کے اپنے درمیان سے حاکم منتخب کریں۔ یعنی پیغمبرؐ کے جانشین کو چنیں۔ بعد میں شیعہ بھائیوں نے اپنے نظریے کی تائید میں کچھ دوسرے دلائل بھی پیش کیے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضور اکرمؐ نے اپنے آخری لمحات میں یہ چاہا کہ ایک وصیت لکھیں۔ یہ دیکھ کر بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور اس کے لکھنے میں مانع ہوئے۔ یہ دیکھ کر حضور اکرمؐ نے یہ ارادہ ترک کیا۔

یہاں اگر واقعاً اس وصیت کے لکھنے پر خداوند عالم کی طرف سے مامور تھے تو یقینی اور حتمی طور پر لکھتے اور لوگوں کے اعتراض اور رکاوٹوں کو اپنے فرائض میں حائل ہونے نہیں دیتے۔

لیکن اس کے بعد چند مواقع ایسے ہیں جہاں ہم حضرت علیؑ کو دیکھتے ہیں سقیفہ

بنی ساعدہ میں قائم ہونے والی خلافت پر اعتراض کرتے ہیں ان کی خلافت کو قبول نہیں کرتے لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے تسلیم کرتے ہیں۔ چاہے وجہ کچھ بھی آپ اسے تسلیم کرلیتے ہیں۔ دوسری طرف ہم فرض کریں کہ علیؑ کی امامت بھی نبوت کی طرح اللہ کی طرف کا ایک عہدہ ہے تو کسی بھی صورت یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ کسی دوسرے کو یہ عہدہ دیا جائے اور علیؑ کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ اس عہدے کو دوسروں کے حوالے کرکے خود سر تسلیم خم ہوجائے اور اسے قانونی پہچنوائے۔

لیکن شیعوں کی دلیل یہاں پر یہی ہے ان کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ کی جانشینی سے مراد صرف سیاسی جانشینی نہیں ہے پیغمبرؐ کا عہدہ صرف سیاسی حیثیت کا نہیں جس کے بارے میں کہیں کہ اس منصب میں انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ اپنا جانشین مقرر کرسکیں۔ بلکہ یہ حق عوام کو حاصل ہے کہ وہ جسے چاہیں اپنا حاکم مقرر کریں۔ پیغمبر ایک مفکر، عالم اور ایک استاد کی مانند ہوتا ہے جس کی تقرری عوام کی طرف سے نہیں کہ ان کا جانشین بھی عوام ہی مقرر کریں۔ وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہوا ہے اگر تمام لوگ مثلاً اسود عنسی گواہی دے دے کہ آپ پیغمبر ہیں۔ یا ایک بھی شخص تسلیم نہ کرے تو بھی آپ پیغمبر اسلام ہیں اور اب اگر تمام لوگ متفق ہوکر گواہی دیں کہ آپ پیغمبر ہیں تو آپ کے پیغمبر ہونے کی قانونی پوزیشن میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوسکتا۔ بنیادی طور پر نبوت کا منصب عوام کی طرف سے منتخب کیا ہوا عہدہ نہیں ہے۔

نبوت کوئی ایسا منصب نہیں کہ لوگ اسے کسی شخص کے حوالے کریں۔ اور نبی کوئی ایسا شخص نہیں جسے لوگوں نے منتخب کرکے بھیجا ہو۔

اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر کا کام اور پیغمبری کی تحریک کسی ایسے جانشین کے ہاتھوں میں رہے جو خود پیغمبر کی جنس 'نوع' حکومت 'اقتدار اور رسالت سے مربوط ہو۔ مثال کے طور پر کسی صوبے کا گورنر اپنے اقتدار تک عوام کے ذریعے پہنچتا ہے اور منتخب ہوتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے تو لوگ کسی دوسرے کو منتخب کرکے اس کی جگہ بھیجتے ہیں۔ لیکن جب ایک استاد ایک خاص طرز فکر پیش کرکے اسے خصوصی طور پر سمجھاتا ہے تو کوئی دوسرا اس کی جگہ خود اس کی طرح پڑھانے اور سمجھانے کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

خصوصاً اس وقت جب اس علم کو خود اس معلم نے ایجاد کیا ہو اور شاگردوں کا ایک جم غفیر اس کا گرویدہ اور معتقد ہوجائے جنہیں وہ تعلیم دے تو اس وقت یہ معلم ہی اس چیز کو جان سکتا ہے کہ اس کے شاگردوں میں سے کونسا شاگرد یا کونسا دوست اس کے درس کو پڑھانے اور اس کی تدریس کا سلسلہ جاری رکھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ معلم کو عوام منتخب کریں۔ بلکہ ایک استاد ہی بہتر طریقے سے اپنی جگہ کسی دوسرے استاد کو منصوب کرسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر کوئی قبول کرنے سے انکار نہیں کرسکتا۔ یا مثال کے طور پر جب کبھی شہر کے امراض قلب کا ماہر ڈاکٹر شہر سے باہر چلا جاتا ہے تو بھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ عوام سے کہہ دے تم ریفرنڈم کرکے میرے بعد کسی شخص کو میری جگہ بٹھادو

اگر کبھی وہ ایسا کہہ دے بھی تو عوام اپنے درمیان میں سے ایک معزز شخص کو چنیں گے جو امراض قلب سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا بلکہ عوام صرف یہ دیکھیں گے کہ معاشرے میں اس کی حیثیت ہے یا نہیں چاہے وہ درد دل سے آشنا ہو یا نہ ہو۔

لیکن اس منزل پر حقیقت یہ ہے کہ اس ماہر قلب کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے سفر پر جاتے وقت خود کسی کے بارے میں کہہ دے کہ میری غیر موجودگی میں فلاں شخص میری جگہ کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہے چونکہ یہ شخص خود امراض قلب کا ماہر ہے لہٰذا اکیلے ہی اپنے جانشین کو معین کر سکتا ہے جبکہ عوام ایسا نہیں کر سکتے۔ اس وقت پوری دنیا میں یہی قانون کارفرما ہے۔

لہٰذا اگر پیغمبر اکرمؐ صرف ایک سیاسی عہدے دار تھے تو دوسرے لوگ ان کے جانشین کا تعین کر سکتے تھے لیکن حضور اکرمؐ ایک خاص ماہر فن' اخلاقی اقتدار کے عہدے دار تھے جسے لوگوں نے منتخب نہیں کیا تھا' چاہے اپنی مخصوص صلاحیتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے یا خداوند عالم کی طرف سے ماموریت رکھتے تھے تو آپؐ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ لوگوں کے لئے اپنے بعد کسی ایسے جانشین کو مقرر کرتے جو زیادہ سے زیادہ آپ کے مشن کو جاری رکھنے کا اہل ہو اور عوام پر بھی لازم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو آپ کے وصی کی حیثیت سے قبول کریں۔ ان دو طرح کے استدلال میں سے کسے قبول کیا جائے؟ کلی طور پر شیعہ بھائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ "پیغمبر اکرمؐ کے بعد معاشرے کی رہبری کا مسئلہ خود پیغمبر کے ذریعے حاصل ہونا چاہئے اور عوام کے انتخاب کا دخل اس میں نہیں ہونا چاہئے۔ چونکہ حضور اکرمؐ

نے اپنے حسن اخلاق سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا اور ان کی تربیت و تزکیہ کرتے ہوئے ایک معاشرے کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ اور ان کے بعد کسی ایسے فرد کے ذریعے اس مشن کو جاری رہنا چاہئے جو خود مکمل طور پر حضورؐ کے ہاتھوں کا تربیت یافتہ ہو۔" اسی طرح ان کے اہل سنت بھائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ "پیغمبر اکرمؐ کے بعد چونکہ معاشرہ حضور اکرمؐ کا تشکیل دیا ہوا ہے اور اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید موجود ہے۔ اسلام کے اصول' احکام اور سنتیں معین ہو چکے ہیں۔ اس بنا پر ہم ایسے کسی شخص کو اپنے درمیان میں سے چن لیں۔ جو معاشرے کے امور کا انتظام سنبھالے اور اس کے دفاع کر سکے۔ تو ہمارے لئے کافی ہے۔

آپ کے خیال میں ان دونوں نظریات میں سے کونسا نظریہ غلط ہے جسے رد کیا جاسکے؟ میرے خیال میں ان دونوں میں سے کوئی بھی غلط نہیں بلکہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ درست ہے دونوں نظریات صحیح ہیں۔ شیعہ جو نظریہ رکھتے ہیں وہ عقل و منطق کے معیار خصوصاً آج کل کے موازین پر پورا اترتا ہے اور معاشرتی اعتبار سے بھی مکمل طور پر درست ہے ساتھ ہی رسولؐ کی سنت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ اپنی دعوت اسلامی کے ابتدائی مرحلے سے لے کر اپنی وفات تک علیؑ پر اعتماد کرتے رہے ہیں سینکڑوں ایسی دلیلیں اور قرائن موجود ہیں کہ قطعی طور پر پیغمبر اکرمؐ یہ چاہتے تھے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے اہل بیتؑ آپ کے مشن کو آگے بڑھائیں۔

اس کے باوجود دوسری طرف ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلام نے اپنی بنیاد

شوریٰ پر رکھی ہے خود حضور اکرمؐ کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی زندگی میں آپ اکثر مشورہ لیتے اور عمل کر لیتے تھے اور بعض اوقات تو دوسروں کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتے تھے۔ اور خود اپنی ذات کو نظر انداز کرتے تھے۔ احد میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کا نظریہ یہ تھا کہ ساری فوج مدینے میں رہے۔ مگر نوجوانوں کا خیال تھا کہ مدینہ سے باہر جا کر دشمن کے ساتھ جنگ کریں۔ لوگوں کی اکثریت نے نوجوانوں کی رائے کو پسند کیا یہ دیکھ کر حضور اکرمؐ نے فوراً ہی زرہ پہنی اور باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اسی طرح جنگ بدر میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں سات کنویں تھے حضور اکرمؐ نے آکر پہلے کنوئیں کے پاس خیمے نصب کئے اتنے میں ایک مجاہد آکر حضور اکرمؐ سے پوچھنے لگا کہ آپ نے یہاں پر خیمہ اپنی رائے سے نصب کیا ہے یا وحی کے مطابق۔ آپؐ نے فرمایا اپنی رائے سے۔ یہ سن کر وہ مجاہد کہنے لگا ہمیں فوجی نقطہ نگاہ سے چاہئے کہ ساتویں کنویں کے پاس خیمے گاڑیں اور دوسرے چھ کنوئیں فوج کے پشت پر ہونے چاہئیں۔ یہ سن کر حضور اکرمؐ نے فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو ساتھ ہی آپ نے خیمے اکھڑوا دیئے اور لا کر ساتویں کنویں کے پاس نصب کرا دیئے اور باقی چھ کنوئیں فوج کے پیٹھ پیچھے کر دیئے تاکہ فوجی اعتبار سے دشمن ان پر قبضہ نہ جمائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ ایسے اہم موقع پر بھی معاشرتی زندگی کے بارے میں دوسروں کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ جنگ موتہ میں حضور اکرمؐ نے تین افراد کو یکے بعد دیگرے سپہ سالار مقرر کیا لیکن چوتھے کو مقرر نہیں فرمایا اور کہا اگر تیسرا سالار بھی شہید ہو جائے تو اپنے درمیان میں سے کسی کو سالار

مقرر کرنا۔ جنگ موتہ میں یہ تینوں سردار لشکر شہید ہوئے تو بقیہ فوج نے خالد بن ولید کو سپہ سالار چنا جسے رسول کریمؐ نے بھی قبول فرمایا یعنی سردار لشکر کے انتخاب کو قبول کیا۔ جبکہ وہ منصوب نہیں تھا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شوریٰ کی بنیاد اسلام میں ہر چیز سے اہم ہے اور معاشرے کی رہنمائی ایک بنیادی کلی ہے۔ حضور اکرم کی سنت بھی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ آپؐ اپنے ذاتی معاملات میں بھی مشورہ عمومی، بیعت اور عوامی رائے اور رائے کی کثرت کو اہمیت دیتے ہیں۔

دوسری طرف جانشینی کا مسئلہ اور اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لئے ایک مخصوص گروہ پر اعتماد کرنا ایسے دو مسئلے ہیں جن میں سے کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اس کی توجیہات و تاویلات تو پیش کی جا سکتی ہیں مگر نفس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ دو متضاد اور مختلف نظریات کو ایک جگہ جمع کیا جا سکے۔ ایک طرف سے تو قرآن کی بنیاد، سنت پیغمبر کی بنیاد، بلکہ اسلام کی روح عوام کے مشورے اور رائے کی کثرت پر تکیہ کرتی ہیں۔ اور دوسری طرف سے خود پیغمبرؐ اپنی خلافت اور جانشینی کے لئے ایک وصی پیش کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے دور کی آخر جنگ "جنگ تبوک" کے موقع پر بے مثل سپہ سالار علیؑ کو مدینہ میں ہی رکنے کا حکم دیا اور ایسے بوڑھوں کو میدان جنگ لے گئے جو جنگ کے کام کے نہ تھے یہ لوگ اصلاً جنگ کرنے کے قابل نہ تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پینسٹھ سالہ بوڑھے کو جو قریش مکہ کی ایک بڑی شخصیت ہیں اور اپنی عمر کی بناء پر کسی جنگ وغیرہ کے قابل بھی نہیں۔ پھر بھی نوجوان اسامہ

کی سرداری میں شمالی سرحدوں میں روم کے ساتھ جنگ کے لئے بھیجتے ہیں اور یہ اسلامی بڑی بڑی شخصیتوں کو اسی نوجوان سپہ سالار کے زیر فرمان بنا کر بھیجتے ہیں اور نوجوان زید بن حارث کا بیٹا اسامہ تھا۔ جسے سردار بنایا اور محاذ کی طرف بھیجا۔ کیا کسی کو معلوم ہے کہ علیؑ کو اس جنگ میں کیوں نہیں بھیجا۔ علیؑ اس وقت سپہ سالاری کے لئے کچھ زیادہ ہی صلاحیت رکھتے تھے۔ مدینہ میں علیؑ رہ گئے وہی علیؑ جو مرد میدان ہیں گھر میں پڑے رہنے والے نہیں۔

حضور اکرمؐ کے آخری لمحات تھے اس وقت بھی آپ شاید اصرار کر رہے تھے یہ فوج "لشکر اسامہ" روانہ ہو جائے۔ جانتے ہیں کہ ابھی بستر مرگ پر ہیں یہ لشکر چلا جائے گا تو مدینہ بغیر فوج کے رہ جائے گا۔ اور مدینہ کو فوج کے بغیر چھوڑنا خطرناک ہے' لیکن اس کے باوجود یہ رسک لیتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ علیؑ زندہ رہیں۔

جنگ تبوک میں پیغمبر اکرمؐ ۶۲ سال کی عمر میں لشکر کے ساتھ سخت اور پرپیچ راہوں کو عبور کرتے ہیں۔ صحراؤں کو طے کرتے اور رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے ۹۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں اس جنگ میں سب موجود ہیں۔ لیکن اسی علیؑ کو گھر میں رہنے کی تاکید کی ہے چونکہ علیؑ مرد میدان تھے' آزردہ ہوتے ہیں اور پیغمبر اکرمؐ کے پاس پہنچ کر شکایت کرتے ہیں مجھے شہر میں رہنے کو کہا ہے اس لئے لوگ تنقید کرتے ہیں' اعتراض کرتے ہیں اور طعنے دیتے ہیں۔ لیکن پیغمبر اکرمؐ بڑے اصرار کے ساتھ انہیں میدان جنگ جانے سے روکتے ہیں'

سپاہیوں کے درمیان سے واپس بلا کر کہتے ہیں۔ "میں نے تمہیں اس لئے شہر میں چھوڑا ہے تاکہ تم میری جگہ سنبھال سکو۔"

یہ واقعات ایسے ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ چاہتے ہیں کہ یہ شخص آپ کے بعد کے لئے زندہ رہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی ناقابل قبول اور غیر منطقی ہے کہ ایک ایسا گروہ جس نے اپنی پوری زندگی اپنا مال یعنی سب کچھ پیغمبر کے حوالے کیا ہو ایسے لوگوں کو پیغمبر اکرمؐ نظر انداز کریں یعنی مہاجرین و انصار کے یہ دونوں گروہ تھے جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی حمایت میں فداکاری و جان نثاری کا ثبوت دیا تھا۔ تو کیا اس بنیادی اور اصل معاملے میں پیغمبر اکرمؐ ان کو نظر انداز کر کے صرف جانشینی پر انحصار کریں گے؟

اور اس کے بعد یہی دونوں گروہ (مہاجر و انصار) ایک جھوٹی کو بنیاد جس کا کوئی وجود نہیں تھا بدعت کے عنوان سے ایجاد کریں پھر اسی بنیاد پر ایک مقررشدہ حق کو غصب کریں اور تمام مسلمان اسے قبول بھی کریں یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر ایسا بھی نہیں ہوا ہے تو پھر کیا ہوا؟ دراصل جو کچھ بعد میں ہوا اور جو کچھ پیغمبر اکرمؐ نے کیا کلی طور پر ایک "کلی بنیاد" تھی۔ اگر صرف یہ جملہ ذہن میں واضح ہو جائے تو گویا میں اپنا مطلب پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ (تمام فکری معاشرتی معاملات میں بھی یہی اصول کار فرما ہے) اور وہ یہ ہے کہ ہمیشہ کسی حق کو ضائع کرنے کے لئے دوسرے حق کو استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ "یعنی ہمیشہ سے یہ ہوتا رہا ہے کہ کسی مکتب میں موجود کسی بنیاد کو نظر انداز

کرنے کے لئے کسی دوسری بنیاد پر تکیہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے مومن گروہ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنے مذہب کے ایک بنیادی معاملے کو الٹ پھیر کر کے ختم کریں۔ تو پھر یہ کام کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس طرح کہ انہیں کسی ایسے دوسرے بنیادی کام کی طرف دعوت دی جائے جو ان کے دین میں ہے۔

مثال کے طور پر اگر دینداروں کا ایک گروہ ایک نمایاں معاشرتی خدمت انجام دینا چاہئیں اور مقابل کا ایک گروہ انہیں اس کام سے روکنا چاہے تو ان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ دینداروں کو جو ہر وقت عبادات و زیارت میں مشغول رہتے ہیں، رقص و سرور اور موسیقی میں مشغول کر سکیں۔ کیونکہ وہ دیندار کبھی بھی موسیقی نہیں سنیں گے تو اس وقت وہ گروہ کیا کرے گا۔ وہ اس وقت دوسرے کسی ایسے بنیادی معاملے کو پیش کرے گا جو اس مذہب میں موجود ہے تاکہ پہلے والے بنیادی معاملے سے توجہ ہٹا دی جائے۔ یہ بات واضح ہے جہاد کو نماز کے ذریعہ ختم کیا جاتا ہے۔ نہ کہ رقص و سرور کے ذریعے۔ ایک مجاہد مومن رقص و سرور کی بنا پر جہاد سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مواقع میں نماز کی بنا پر جہاد کو نظرانداز کرے کیونکہ وہ صحیح طرح سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔

چونکہ نماز اسلام میں ایک بنیاد ہے اور اسلام کے ارکان میں سے ہے۔ لہٰذا اگر بعض شرائط کے تحت ایسے لوگوں کو غیر معمولی حد تک یعنی افراط کی حد تک نماز میں سرگرم رکھا جائے تو جہاد سے منہ موڑ سکتا ہے یعنی ایک انفرادی مذہبی کام پر تکیہ کر کے ایک معاشرتی مذہبی فریضے کو نظرانداز کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہل

مذاہب نے ہمیشہ کسی دوسرے ایسے اصل جو ان کے مذہب میں موجود ہے کو بنیاد بنا کر انحراف اختیار کیا ہے۔ وصیت اور جانشینی کے بارے میں بھی ایسا ہی ہوا یعنی پیغمبر اکرمؐ کے بعد محدود اور متعین کئے ہوئے جانشینوں جن کا تعین پیغمبرؐ کو خود کرنا چاہئے تھا اور کیا بھی تھا۔ اسے ایک دوسرے اصل جو کہ بیعت اور عوامی رائے ہے جو خود اسلام میں ہے' قرآن میں ہے' سنت پیغمبرؐ اور روح اسلام کے ساتھ مکمل موافق بھی ہے' کے ذریعے نظرانداز کیا گیا اگر واقعاً "عوامی رائے شوریٰ اور انتخاب کرنے کا معاملہ جھوٹ' اور جعلی ہوتا تو یقینی طور پر چند افراد پانچ' دس' بیس یا کچھ زیادہ اس فریب میں مبتلا ہوتے اور اس کام میں لگ جاتے اور ساتھ ہی اسلامی معاشرے میں رسول اکرمؐ کے بڑے بڑے صحابہ کی موجودگی میں یہ کام نہیں ہو پاتا۔ اگر ایسا تھا تو اکثریت نے اعتراض کیوں نہیں کیا؟ کیوں بڑی آسانی کے ساتھ قبول کیا؟ صرف اس لئے کہ یہ ایک اسلامی بنیاد ہے؟ لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک اسلامی رکن دوسرے رکن کے ضد اور مقابل قرار پائے' کیونکہ شہری قانون' فلسفہ قانون اور معاشرتی مسائل میں ایک شق یہ ہے کہ ہر قانون سے بلند اور برتر ایک اور قانون ہے اور یہی صورت احکام دینی میں بھی ہے۔ مثلاً ایک دفعہ عین جہاد کے وقت حضور اکرمؐ نے روزہ توڑنے کا حکم دیا جبکہ روزہ ایک اسلامی حکم ہے اور جہاد بھی ایک اسلامی حکم ہے۔"

جنگ تبوک میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آپ نے حکم دیا کہ مکمل تیاری کے ساتھ چلیں۔ اس موقع پر ایک چالاک شخص نے اپنی ذمہ داری

سے جان چھڑانے کے لئے ایک بہانہ تراشا تھا شاید اس طرح کے لوگوں کی تعداد اسلام میں کچھ زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ شخص پیغمبر اکرمؐ کے حضور آیا اور کہا "میں اس جنگ میں شمولیت سے معذرت چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی ایک کمزوری کی وجہ سے مجبور ہوں پیغمبر اکرمؐ نے پوچھا تمہاری مجبوری کیا ہے؟ اس نے کہا میں جذباتی اعتبار سے بہت جلد مغلوب ہو جاتا ہوں اور خوبصورتی کو دیکھ کر میں اپنے آپ میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے خوف آتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ چلوں اور تبوک کی حسین و جمیل لڑکیوں کے چشم و ابرو اور غمزہ کے تیروں کا شکار ہو کر شیطانی وسوسہ میں مبتلا ہو جاؤں اور اس طرح دین سے خارج ہو جاؤں۔" حضور اکرمؐ نے اس کے اس کہنے پر نفرت کا اظہار فرمایا اور کہا دفع ہو جاؤ یہیں رہو اور یہیں مر جاؤ یعنی حضور اکرمؐ ایسے افراد سے شدید نفرت کرتے ہیں جو اسلام کے نام پر اسلام اور رسول اسلامؐ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ ہم یہاں پر دیکھتے ہیں کہ یہ شخص ایک اسلامی حکم سے روگردانی کرنے کے لئے دوسرے ایک حکم کو وسیلہ بنا رہا ہے۔ یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ آج رات مجھے تاش کھیلنے ہیں لہٰذا میں آپ کے ساتھ جنگ میں نہیں آسکتا بلکہ ایک اسلامی حکم سامنے لے آیا۔

یہ اصول آپ مد نظر رکھیں کہ ہمیشہ ایک قانون یا حکم ہمیشہ کسی دوسرے قانون یا حکم سے بالا ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ اوپر والے اصل یا حکم کے لئے نچلے احکام اور قوانین وسیلہ بن جاتے ہیں یا ایک مقدم اصل یا حکم کے لئے ایک متاخر اصل یا حکم وسیلہ بنتا ہے جو خود بھی اسی دین کا جزو ہوتا ہے۔ مگر یہاں ایک نکتہ اور بھی

ہے کہ وصایت کی اصل یعنی جانشینی کا تعین کرنا پیغمبر کے ہاتھ میں ہے۔ اور بیعت و شوریٰ کی اصل یعنی جانشینی کا تقرر کرنا لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ دونوں اصول ایک ہی دین کے اصول ہوں۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ ایسا ہی ہے مگر کیسے؟ اس کے جواب کے لئے کہاں سے سند پیش کروں۔

اب اس کی تشریح اور وضاحت کروں گا کہ خود شیعوں کو بھی اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا ان کا عقیدہ یہ ہے پیغمبر اکرمؐ کے ذریعے مقرر کئے ہوئے جانشین بارہ ہیں اس سے زیادہ کے معتقد نہیں۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے مذہب کو آخری کامل مذہب کی حیثیت سے پہچنوایا ہے۔ یعنی وہ مذہب جس کی طرف عالم بشریت رجوع کرے مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ پہلے تو یہ کہ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں کہ یہ دین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے مگر بعد میں معاشرے کے لئے رہبر اور جانشین صرف بارہ مقرر فرماتے ہیں۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جانشین مقرر نہیں فرماتے اور یہ نہیں فرمایا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری نسل میں سے جو بھی ہو جہاں پر بھی ہو وہی معاشرے کا رہبر اور امام ہوگا۔ کبھی بھی حضور اکرمؐ نے ایسا نہیں فرمایا کیونکہ امامت کوئی ایسا عہدہ نہیں جو اولاد کے لئے وقف ہو بلکہ صرف اور صرف پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی کا مرحلہ ہے جو صرف اور صرف بارہ کی تعداد پر منحصر ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے مان لیا اور یہ بھی فرض کیا کہ پیغمبر اکرمؐ کا تعین عمل میں آیا اور ان حضرات نے اپنی مدت خلافت پوری بھی کی اور پیغمبر اکرمؐ کی خواہش کے مطابق اسلامی معاشرے کی رہبری کا حق ادا کیا مگر ان کے لئے

کیا کیا۔ ان کے بعد تو کوئی معین نہیں ہوا اور نہ اس بارے میں پیغمبرؐ کی بھی کوئی وصیت ہے جس میں ان کے نام یا تعین کا ذکر ہو۔ کسی کے بارے میں ایسا ذکر نہیں ملتا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے یہ سمجھایا کہ امت والے اس مرحلے پر دوسرے اصل یعنی شوریٰ اور بیعت سے کام لیں کیونکہ یہ دین اور مذہب ہمیشہ رہنے والا ہے۔

پس یہ مسئلہ اس صورت میں حل ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد تاریخ میں دو مرحلے تھے پہلا مرحلہ ایک خاص وقت تک نظر آتا ہے جہاں یکے بعد دیگرے پیغمبر اکرمؐ کی آل میں سے بارہ افراد اسلامی معاشرے کی حکومت اور تاریخ اسلام کی رہبری اور اسلامی معاشرے کی تربیت، پیغمبر اکرمؐ کی وصیت اور تعین کے مطابق کریں۔

اس کے بعد کے لئے چونکہ پیغمبر اکرمؐ خاموش ہیں مگر اسلامی معاشرہ اور مذہب اسلام جاری و ساری ہیں اور یہ دونوں بارہ افراد کی حکومت و رہبری کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے ہیں اور پیغمبر اکرمؐ بھی اس بارے میں خاموش ہیں اور جانشین بھی متعین نہیں ہوا ہے لہذا مسلمان دوسرے اصل یعنی بیعت و شوریٰ کے سہارے پر ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ آج تیسری دنیا یعنی امریکہ، افریقہ، ایشیا اور خصوصی طور پر وہ ممالک جنہوں نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے اور ابھی چاہتے ہیں کہ اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف قدم بڑھائیں وہ اسی بنیاد کے قائل ہیں۔

یعنی وہ لوگ جو ایک انقلاب برپا کرتے ہیں اپنے معاشرے کو آزادی دلاتے ہیں اور بعد میں چاہتے ہیں کہ اپنے معاشرے کو ترقی سے ہمکنار کریں تو دیکھتے ہیں کہ اگر اس مرحلے میں وہ عوام کی رائے کا سہارا لیتے ہیں تو عوام وہ لوگ ہیں جو اپنے ووٹ کو پانچ روپے پر فروخت کرتے ہیں یا ایک وقت کا کھانا کھلا کر ایک آدمی سو ووٹ حاصل کر سکتا ہے۔ عوام میں ایسے ایسے قبائل موجود ہیں جہاں پانچ ہزار یا دس ہزار افراد ہوتے ہیں مگر ان کا ووٹ ایک آدمی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور وہ آدمی اس قبیلے کا سردار، وڈیرہ، خان یا چودھری ہوتا ہے۔ اگر تم نے اس سردار، وڈیرے، خان یا چودھری کو خریدا (عام طور پر اسے ایک وقت کا کھانا کھلا کر خرید سکتے ہیں) تو گویا پورے دس ہزار ووٹ خریدے تو ایسے حالات میں کہ دشمن طاقتور ہے اور معاشرہ اپنے پاؤں پر قائم بھی نہیں ہو پایا ہے اور قبیلوں اور گروہوں کی صورت میں ہے تو کیا کوئی شخص معاشرے میں اثر و رسوخ پیدا کرتے ہوئے عوامی فکر کو درست کر کے انقلابی راہ پر لگا سکتا ہے؟ کیونکہ ایسے معاشرے میں طاقتور، اشراف، دولتمند اور مقتدر افراد کا تسلط ہوتا ہے۔ انقلابی گروہ کی پارٹی کے افراد بھی آزادی رائے کا سیاسی شعور نہیں رکھتے۔ اس معاشرے میں انقلابی رہبری نے استعمار کے پنجے اکھاڑ کر معاشرے کو آزادی دی ہے۔ مگر اس کی فکری نشوونما نہیں ہو پائی ہے۔ ایسے عوام تو اس کے اندر موجود ہیں جبکہ باہر سے دشمن اسے ڈرا رہے ہیں اب اگر ایسے حالات میں معاشرے کی رہبری کا انتخاب عوام کی رائے کے حوالے کیا جائے تو قوی امکان ہے کہ کوئی ایسا شخص منتخب ہو جو بہت

جلد دشمن کے کام آئے گا۔ لہٰذا یہ انقلابی کسی بھی صورت رہبری کے معاملے کو ایسے افراد کے ہاتھ میں نہیں دیں گے جو رہبری کو نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے بلکہ رہبری اسی انقلابی گروہ کے درمیان میں سے کسی شخص کے ذمے لگائیں گے جنہوں نے انقلاب شروع کیا تھا تاکہ اس کی زیر ہدایت ایک مدت تک یہ "انقلابی دور" یا "مشروط جمہوریت" رہے تاکہ اس دوران انقلابی گروہ عوام پر حکومت کرے اور انقلابی گروہ کی طرف سے ہی رہبری کے فرائض کی ادائیگی کرے مگر لوگوں کی رائے لئے بغیر کب تک؟ اس وقت تک جب تک عوام میں سے ہر فرد اپنی رائے کا مالک بنے جو بھی شخص معاشرے میں موجود ہے اپنی رائے کا حامل خود ہو۔

لیکن اگر دس ہزار افراد یہ دیکھنے لگیں کہ سعد بن معاذ یا سعد بن معاذ کیا کہتا ہے ہم بھی ایسا ہی کریں گے تو یہ دس ہزار افراد دس ہزار ووٹ نہیں ہیں بلکہ ایک ووٹ ہے۔ لہٰذا ہم پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے معاشرے میں دیکھتے ہیں جو دس سال کے عرصے میں وجود میں آیا تھا ابھی ان کے درمیان اشرافیت زندہ اور موجود تھی۔ اب بھی بوڑھے لوگوں کو قابل ترین نوجوانوں سے برتر ہی سمجھا جاتا تھا۔ زید بن اسامہ جسے رسول اکرمؐ نے بڑی عزت بخشی ان کے شہید باپ کو بھی عزت دی تھی اور اسے اپنا عزیز دوست سمجھتے تھے پیغمبر اکرمؐ کی اس قدر عزت افزائی کے باوجود صرف اس جرم میں کہ یہ اٹھارہ سال کا نوجوان ہے جبکہ ہم قوم کے شیوخ ہیں کہ کہ پیغمبر اکرمؐ کے حکم کی تعمیل میں چوں و چرا کرنے لگے۔ یہی عادت آج بیسویں

صدی میں بھی موجود ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ ان کی فضیلت زیادہ ہے حقیقت کا زیادہ طرف دار ہے۔ جوش و جذبہ بھی رکھتا ہے، علم میں بھی بڑھ کر ہے، جوانمردی میں بھی اول ہے مگر نوجوان ہے۔ ابھی عمر پختہ نہیں ہوئی ہے۔ انہیں ابھی اور پختگی حاصل ہونی چاہئے۔ ساتھ ہی ایک بوڑھے کو جو بیمار ہے ہر وقت کھانستا رہتا ہے اسے سہارا دے کر اٹھایا جاتا ہے اور درود پڑھتے ہوئے آگے لے آتے ہیں کہ یہ شخص اس نوجوان پر باوجود اس کی فضیلتوں کے برتری رکھتا ہے۔ (کیونکہ یہ بوڑھا ہے)

آج ہم جب غور و فکر کریں تو پتہ چلتا ہے کہ مدینے میں اس زمانے کا معاشرہ بھی اسی صورت کا حامل تھا جیسے آج کل لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کا ہے جنہوں نے تازہ تازہ پسماندگی، جہالت اور استعمار کے پنجے سے آزادی حاصل کی ہے ایک انقلابی صورت حال نافذ ہے جس میں عوامی اور جمہوری حکومت کی ضرورت نہیں بلکہ ایک عبوری اور انقلابی حکومت کی ضرورت ہے، اس انقلاب کو تقویت بخش سکتی ہے۔ یہ عرصہ خاص وقت تک کا ہوتا ہے جس میں یہ انقلابی حکومت معاشرے کو اندرونی طور پر تیار کرتی ہے اور افراد معاشرہ کے سیاسی شعور کو بلند کرتی ہے اور معاشرے کے ہر فرد کو ایک مستقل فرد بناتی ہے اور اسے سیاسی اور فکری حیثیت کا حامل بنا سکتی ہے۔ اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جو بیرونی ایجنٹ معاشرے میں اس انقلاب کے خلاف کام کرتے ہیں ان کا قلع قمع کرتے ہیں اس کے بعد ہی ایک منزل ایسی آسکتی ہے کہ معاشرے کا ہر فرد مستقل رائے کا

حائل بنے۔ اب اس مرحلے کے بعد شوریٰ اور بیعت کا مرحلہ آسکتا ہے۔ اور لوگ مل بیٹھیں ہر ایک اپنی رائے کا اظہار کرے اور ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کرتے ہوئے بغیر کسی کے نفوذ کے یعنی کسی سرمایہ دار، اشراف اور پیسے والے، سردار اور قبائل کے دباؤ میں آئے بغیر خود اپنے استقلال کے ساتھ صحیح رائے دے سکیں کہ کون معاشرے کی رہبری کے لئے مناسب اور موزوں ہے۔

لیکن ایک ایسے وقت میں جبکہ معاشرے کے افراد انقلابی اور سیاسی شعور میں اس حد تک نہ پہنچے ہوں اور عوامی ووٹ قبائلی، قومی، لسانی یا مہاجر و انصار کی بنیادوں پر ہوں تو انقلابی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے ایسی معاشرتی گروہ بندیوں کی موجودگی میں ایسے عوامی ووٹ یا رائے پر بھروسہ کرنا، عوامی حق رائے اور خود عوام کے ساتھ دشمنی کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اس وقت عوام میں فکری، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی شعور تکمیل تک نہیں پہنچا ہے۔ اور ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ بڑی آسانی سے خود (کو) اپنے مستقبل کو اور معاشرے کی قسمت کو سستے داموں فروخت کریں۔

فضا ایسی ہی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ بات قبول کرنی چاہئے کہ ایک معاشرہ فقط دس سالوں میں تشکیل نہیں پاتا اس دوران صرف اس کے خدوخال واضح ہو جاتے ہیں اور اس کے افراد اس کے تہذیبی و تمدنی اقتدار سے مضبوط نہیں ہو پاتے۔

اسلامی معاشرہ تو وہ امت ہے جس کے ہر فرد کو چاہئے کہ وہ ایک مستقل انسان، قومی رائے رکھنے والا، اور خود مستقل رائے رکھنے والا ہو۔

لہٰذا پیغمبر اکرمؐ کو چاہئے تھا کہ ایک ایسا سلسلہ قائم کرتے کہ آپ کا دس سال والا کام دوسرے سو سال، ڈیڑھ سو سال یا دو سو سال تک جاری و ساری رہتا تاکہ اسلامی معاشرے کا ہر فرد سیاسی شعور کی اس حد تک پہنچتا کہ بغیر کسی بیرونی اشارے کے اپنی رائے کا برملا اظہار کرتا اور رائے بھی درست دیتا۔

یہی وجہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے اگر پیغمبر اکرمؐ کے بعد بنی امیہ اور بنو عباس کے خلفاء کے بجائے ائمہ اثنا عشری حاکم ہوتے مثال کے طور پر یزید کی جگہ حسینؑ حاکم ہوتے، معاویہ کی جگہ حسنؑ حکمران ہوتے اور ابوالعباس سفاح کی جگہ امام محمد باقر علیہ السلام ہوتے، مروان کی جگہ امام جعفر صادق علیہ السلام ہوتے، یہ سلسلہ جاری رہتا اور ۲۵۰ سال تک اسلامی معاشرہ ان جیسی شخصیات کی رہبری میں گزار لیتا اور اس کے بعد انتخابات ہوتے تو زیادہ آسانی کے ساتھ عوام بہترین اسلامی شخصیات کو ووٹ کے ذریعے چن سکتے کیونکہ اس وقت معاشرے کے افراد کا سیاسی شعور مکمل ہو چکا ہوتا اور معاشرتی نشوونما بھی کامل ہو چکی ہوتی۔ کاش ایسا ہوتا تو صرف ۳۰ سال کی مدت میں عوامی رائے کا جنازہ نہ نکل جاتا اور امیر معاویہ عوامی رائے کا گلا گھونٹ کر حکومت جمہوری کو ملوکیت میں تبدیل نہ کر سکتا اور نہ ہی یزید کو جانشین بنا سکتا۔ اس بارے میں میرا اعتراض صرف اور صرف یہی ہے اور یہ میرا ذاتی عقیدہ ہے نہ تو مجھے بیعت و شوریٰ پر اعتراض ہے اور نہ ہی جانشینی کے بارے میں ادنیٰ سا شک ہے۔ جانشینی کا مسئلہ جیسا کہ اہل تشیع بھائی کہتے ہیں۔ ایک واقعیت ہے عقلی و منطقی ہونے کے ساتھ

ساتھ تاریخی حقیقت بھی ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔ اور بیعت و شوریٰ بھی جیسا کہ ہمارے اہل سنت بھائی کہتے ہیں انسان شناسی اور حریت پسندی کے اعتبار سے ایک ترقی پذیر بنیاد ہے اور ایک ایسی بنیاد ہے جو اسلام میں موجود ہے اور پیغمبرؐ کی سنت بھی یہی رہی ہے لیکن میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے فوراً" بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں ہونے والے انتخابات کاش ۲۵۰ سال بعد ہو چکے ہوتے (تو صرف تیس سال بعد جمہوریت کا گلا نہیں گھونٹا جا سکتا تھا)

ہم دیکھتے ہیں کہ امام کا مسئلہ صرف بارہ مقدس افراد پر عقیدہ رکھنے کی حد تک نہیں بلکہ یہ ایک ہمیشہ زندہ رہنے والا انسانی اسلوب حکومت ہے جو دوسرے تمام نظاموں کے مقابل میں موجود ہے۔ یہ صرف عقیدہ کی حد تک کا کوئی معاملہ نہیں کہ جس کے بارے میں کچھ لوگ کہہ دیں کہ گزشتہ را صلوت کے مصداق اسے بھول جائیں ہم یہ نہیں چاہتے کہ ماضی کی طرف لوٹ کر آپس میں دشمنیاں ایجاد کریں۔ کیونکہ ایسا کرنا اسلام اور عالم انسانیت کے ساتھ 'عالم تشیع کے ساتھ 'عالم تسنن کے ساتھ ایک خیانت ہے۔ ہم تفرقہ پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ماضی کی تاریخی کینہ توزیوں کو زندہ کریں۔ ہم اس نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں کہ نہ صرف تفرقہ پیدا نہ ہو بلکہ وحدت و اتحاد کی بنیاد فراہم ہو۔ اس طرح کہ وہ ہمیں جعلی بتانے پر مصر نہ رہیں اور نہ ہم ان کی تکفیر کریں۔ اور مرتد بتائیں۔ یہی عامل ہے جو عالم تشیع کی حقیقت کو دوام بخش سکتا ہے اور یہ اسلام کے باہر کی کوئی شکل نہیں بلکہ خود اسلام کو ایک طرح کا سمجھنا اور بنیادی طور پر حال کو بھی سمجھنا ہے۔